فقاہتِ امام بخاریؒ

تقریبِ صحیح بخاری میں فضیلۃ الشیخ مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب الزاہدی کا خطاب

۱۱ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ (مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۹۵ء) بروز سوموار، بعد از نمازِ عصر جامعہ علوم اثریہ جہلم کے زیرِ اہتمام مرکزی جامع اہل حدیث، چوک اہل حدیث جہلم میں تقریبِ تکمیل صحیح بخاری شریف منعقد ہوئی۔ اس سال سات طلباء: (۱) جنید اللہ افغانی (۲) عامر شریف گجراتی (۳) محمد اسلم افغانی (۴) محمد قاسم افغانی (۵) نعیم اللہ افغانی (۶) عبدالعزیز نورستانی اور (۷) عبدالواسع افغانی نے سندِ فراغت حاصل کی —— تقریب میں شیخ الحدیث مولانا پیر محمد یعقوب صاحب قریشی اور رئیس مجلس التحقیق الاسلامی مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب الزاہدی نے خطاب فرمایا — آئندہ سطور میں "فقاہتِ امام بخاریؒ" کے موضوع پر حافظ صاحب کا خطاب ہدیۂ قارئین ہے!

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکّل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضلّ لہٗ ومن یضلل فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لّا الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد انّ محمّدًا عبدہٗ ورسولہٗ —

امّا بعد:

معزز اساتذہ کرام، حاضرین —— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کی اس تقریبِ سعید میں ہم اس امر پر بحث کریں گے کہ امام بخاریؒ کس قسم کی فقہ کے ترجمان ہیں، ان کی فقہ کا کیا انداز ہے اور دوسرے فقہاء سے امام صاحب کی کیا خصوصیت

ہے ؟ اس کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ فقہ ہوتی کیا ہے، اس کی تعریف درصفت کیا ہے ؟

قرآنِ پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہ کی جو تعریف بیان فرمائی ہے، اس کے دو عناصر ہیں ـــــ ایک یہ کہ قرآنِ مجید کو اچھی طرح سمجھنا، اور دوسرے حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا علم حاصل کرنا ـــــ آپؐ کا ارشادِ گرامی ہے :

"من یّرد اللہ خیرًا یّفقّهه فی الدّین!"

"اللہ ربّ العزّت جس پر اپنے خاص احسان کا ارادہ فرماتے ہیں، اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما دیتے ہیں" ـــــ یعنی اسے یہ سمجھا دیتے ہیں کہ شریعت نے انسان سے کہا کیا ہے ؟ ـــــ یہ ہے فقہ کی بنیاد !

اب فقہ کی تعریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنیئے، آپؐ نے فرمایا :

"نضّر اللہ عبدًا سمع مقالتی فحفظها فوعاها و ادّاها"

"اللہ تعالیٰ اس آدمی کو خوش رکھے، جس نے میری بات کو سُنا، اس کی حفاظت کی، اسے یاد رکھا اور آگے بیان کیا !"

یہ دعاء دینے کے بعد آپؐ نے فرمایا :

"ورُبّ حامِلِ فقہٍ الیٰ من ھو افقہ منہ"

گویا آپؐ نے حاملِ فقہ اسے قرار دیا جو آپؐ کی بات کو سننے والا، اسے یاد رکھنے والا اور اسے آگے پہنچانے والا ہے ـــــ معلوم ہوا کہ فقیہ وہ ہے جسے قرآن آتا ہو، حدیث آتی ہو، اور جسے یہ سمجھ آجائے کہ اللہ ربّ العزّت بندے سے چاہتے کیا ہیں ؟ ـــــ جب کہ بعض لوگ فقہ کا مفہوم بغیر حدیث کے مکمل کر لینا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث نہیں بھی آتی، لیکن اس میں سمجھ بوجھ رکھتا ہو، ایسا آدمی فقیہہ ہے ! ـــــ بھائی، یہ کیسے ممکن ہے ؟ اسے حدیث تو آتی نہیں، اس کی صحت، اور اس کے ضعف کا تو اسے علم نہیں، بایں ہمہ وہ اس کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو ! ـــــ فقہ کا تو سب سے بڑا عنصر حدیث رسول اللہ ہے جیسا کہ بیان ہوا !

جو بھی شخص حدیث میں کمزور ہوگا، شریعت نے اس کو فقیہ نہیں کہا ـــــ ہاں جس کے پاس حدیث کا علم ہے، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہاں فقیہ ہے، خواہ لوگ اسے فقیہ

مانیں یا نہ مانیں !

یہاں بڑی دیر سے قضیہ یہ چلا آرہا ہے کہ ابو ہریرہؓ غیر فقیہ ہیں، انسؓ بھی غیر فقیہ ہیں، فلاں صحابیؓ بھی غیر فقیہ ہیں ـــ یہ کتنے بڑے ستم کی بات ہے کہ صحابۂ رسولؐ تو غیر فقیہ ہوگئے، اور جنھیں حدیث کا علم نہیں وہ فقیہ بن گئے ! بہر حال شریعت اسلامیہ کے نزدیک فقہ کا سب سے بڑا رکن علم حدیث ہے، اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ جو شخص قرآنِ مجید کا عالم ہو، حدیثِ رسولؐ کا علم رکھتا ہو، اور جسے یہ معلوم ہو کہ کتاب و سنت میں اللہ رب العزت نے انسان سے چاہا کیا اور فرمایا کیا ہے، ایسا شخص ہی فقیہ ہے اِس کے برعکس جس شخص کو حدیث نہیں آتی، شریعت کے ہاں وہ فقیہ نہیں ہے۔

اب چونکہ فقہ کی تعریف میں اختلاف پیدا ہوا، لہٰذا فقہ کے انداز میں بھی اختلاف پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں فقہ کا انداز یہی تھا کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیش آیا، فوراً احادیث رسولؐ کی طرف رجوع کیا گیا اور "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہہ کر فتویٰ دے دیا گیا ـــ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی جتنی بھی روایات ہیں، وہ ان کے فتوے ہیں ـــ اس کے بعد تابعینؒ کے زمانہ میں بھی مدینہ منورہ کے تمام علماء کی فقہ کا انداز یہی رہا کہ حدیث کا علم حاصل کیا، احادیث کو جمع کیا اور قرآنِ مجید کی تفسیر کو ان کی روشنی میں سمجھا ـــ گویا وہ بہت بڑے مفسر بننے سے پہلے بہت بڑے محدّث ہوا کرتے تھے اور فقاہت کا لقب حاصل کرنے سے پہلے بہت بڑے مفسر ہوا کرتے تھے ـــ لیکن چوں کہ یہ کام بہت ہی مشکل تھا کہ احادیث کی سندیں یاد کی جائیں، ان کے متون حفظ کیے جائیں اور راویوں کو جرح و تعدیل کی میزان میں پرکھا جائے، اس لیے بہت سے علاقوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ حدیث جس طرح سنی اور پہنچ گئی، بغیر یہ تحقیق کیے کہ بلحاظِ سند اس کی حیثیت کیا ہے، اسی پر بحث کر کے نئے نئے مسائل اخذ کیے جانے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اجتہاد کے بنیادی ڈھانچے میں ہی بہت سی خامیاں پیدا ہوگئیں ـــ یوں امت میں دو طرح کے فقہی انداز متعارف ہوئے، ایک فقہی انداز تھا اہلِ حدیث کا اور دوسرا فقہی انداز تھا اہل الرائے کا۔ اہل الرائے چونکہ حدیث میں کمزور تھے، اس لیے ان کے اجتہادات میں بہت سے مسائل ایسے تھے جو شریعت اور مقاصدِ شریعت کے خلاف تھے ـــ ان کو اہل الرائے کہا ہی اس لیے گیا کہ ان کے اجتہادات کی بنیاد متون و نصوص پہ نہیں ہوا کرتی تھی،

جیسا کہ آئندہ چل کر ہم وضاحت کریں گے

امام بخاری رحمۃ اللہ اہلِ حدیث کی فقہ کے نمائندہ اور ترجمان ہیں۔ صحیح بخاری میں انھوں نے جہاں صحیح احادیث کو جمع کیا، وہاں انھوں نے اہل الرائے میں پیدا ہو جانے والے غلط فقہی انداز کی تصحیح کا التزام واہتمام کیا۔ آپ نے احادیث سے بہت سے دقیق مسائل کا استنباط کر کے مسلمانوں کے اس عقیدہ کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا کہ کتاب وسنت میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا حل موجود ہے، اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس میں شریعتِ اسلامیہ اپنے ماننے والوں کی راہنمائی نہ کرتی ہو —— لہٰذا ہونا یہی چاہیے کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے، قرآنِ مجید اور احادیث پاک سے اس کا حکم تلاش کیا جائے۔ محدثین کا طریقِ کار یہی تھا کہ وہ ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث میں غور کرتے اور دیکھتے کہ ان میں سے کون کون سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں —— آپ حیران ہوں گے کہ انھوں نے ایک ایک آیتِ قرآنی اور ایک ایک حدیثِ رسولؐ سے سو سو مسائل کا استنباط کیا —— اس کے برعکس اہل الرائے کیا کرتے ہیں؟ —— حدیث تو ہے نہیں، انھوں نے ایک ہی مسئلہ سے کئی کئی مسائل کی تخریج کی —— گویا ایک رویہ تو ہے قرآنی آیات اور احادیث کی نص سے مسئلہ کے استنباط کا، اور دوسرا یہ کہ کسی ایک مسئلہ سے بہت سے مسائل نکالتے چلے جانا —— یہ دو انداز تھے علماء کی فقہ کے، جن کا باہمی فرق ظاہر وبیّن ہے۔ امام بخاریؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صحیح بخاری میں ایک تو محدثین کے طرزِ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے اسے بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا اور دوسرے فقہی منہج کی تصحیح کا التزام واہتمام فرمایا۔

دوسرا بڑا فرق اہل حدیث کی فقہ اور اہل الرائے کی فقہ کے درمیان یہ ہے کہ اجتہادی یعنی غیر منصوص علیہ مسائل میں جب علل اور مقاصد کا اعتبار کیا جاتا ہو، تو محدثین ان مسائل میں ان مقاصد کو بنیاد بناتے ہیں جن پر شریعت کی نص موجود ہو۔ جب کہ اہل الرائے ان مقاصد کو بنیاد بنا کر مسائل کی تخریج کرتے ہیں جو غیر منصوص اور خیالی ہوتے ہیں۔

—— اور تیسرا بہت بڑا فرق فقہ اہل حدیث اور فقہ اہل الرائے کے درمیان یہ ہے کہ محدثین کے ہاں اس امر کا خصوصی اہتمام ہے کہ کتاب وسنت میں جو شرعی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ ان کا شرعی معنیٰ ہی مراد لیتے ہیں اور ان کی تعریف وہی کرتے ہیں جو شریعت چاہتی ہے، جب کہ اہل الرائے ان کا لغوی معنیٰ مراد لیتے ہیں —— اس سلسلہ میں ہم فروع کی بات نہیں

کرتے کہ فلاں مسئلہ یوں ہے اور فلاں یوں، بلکہ ہم اصول کی بات کرتے ہیں جو ساری فقہ کی بنیاد اور ستون ہے ــــ آپ جانتے ہیں کہ مختلف علوم و فنون میں بعض الفاظ اصطلاحی ہوتے ہیں، مثلاً علمِ نحو میں جر، فتحہ، نصب وغیرہ کے الفاظ عام مستعمل ہیں۔ اگر ان کا لغوی معنیٰ مراد لیا جائے گا تو اصطلاحی معنیٰ کی تو کچھ تعبیر نہ ہوگی ــــ یہی حال علم طب اور ڈاکٹری کے فن کا ہے۔ ان علوم کی بھی کچھ اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں، اگر ان کی لغوی تعریف کی جائے گی تو یہ ان کی فنی اور وہ تعبیر نہ ہوگی جو اطباء اور ڈاکٹروں کے ہاں مقصود ہوتی ہے ــــ بالکل اسی طرح شریعت کے بھی کچھ اپنے مخصوص اصطلاحی الفاظ اور کلمات ہیں۔ چنانچہ محدّثین ان کے وہی معنے مراد لیتے ہیں جو شرعًا مقصود ہوتے ہیں، نہ کہ وہ جو عامۃ النّاس لغۃً مراد لیتے ہیں ــــ اس کے برعکس اہل الرائے کیا کرتے ہیں؟ وہ بہت سی اہم جگہوں پہ یہ خطا کر جاتے ہیں کہ شرعی اصطلاحی الفاظ کے وہ معنی مراد لیتے ہیں جو لغت میں ہوتے ہیں ــــ اور یہ بہت بڑی خامی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ شریعت کی ترجمانی قطعًا نہیں ہو پاتی، بلکہ شرعی نص کی تعبیر ہی غلط ہو جاتی ہے۔

اجتہاد کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس مقام پر نص کے سلسلہ میں ایک بات طالب علموں کے لیے بالخصوص نوٹ کرنے کی ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں، جن کا نام لے کر شریعت کوئی حکم بیان کرتی ہے ــــ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فی کلّ اربعین شاۃً شاۃٌ۔"

کہ "ہر چالیس بکریوں میں ایک بکری ہے۔"

یہ زکوٰۃ کا نصاب ہے۔ اب اس نصاب میں چونکہ "شاۃ" کا لفظ آگیا تو یہ بکریوں کے لیے خاص ہوگا، دوسرے جانوروں کا یہ نصاب نہیں ہوگا۔ اسے کہتے ہیں نص خاص، یا "خاص منصوص علیہ"۔

لیکن بعض شرعی نصوص ایسی بھی ہیں کہ جن میں عموم ہوتا ہے اور شریعت ایک صفت بیان کر کے کوئی حکم لگا دیتی ہے ــــ مثلاً شریعت یہ کہتی ہے کہ جن جن جانوروں میں فلاں صفت موجود ہوگی، ان کا کیا ہوا شکار حرام ہے ــــ اب یہاں شریعت نے کسی خاص جانور کا نام نہیں لیا، بلکہ بیان کردہ صفت میں اگر کتّا داخل ہو سکتا ہے تو بعض پرندے بھی اس میں آجاتے ہیں ــــ اسے کہتے ہیں، نص عام، یا "عام منصوص علیہ"۔ اس کے بعد جو مسائل ان نصوص سے خارج رہ جاتے ہیں تو ان میں حکمت اور مقاصدِ شریعت کا اعتبار کیا جائے گا، جن

پر قبل ازیں اس مجلس میں کافی گفتگو ہو چکی ہے!

اب آئیے لفظی دلالت کی طرف کہ جس کی بات چل رہی ہے ـــــ اس سلسلہ میں ہم بعض مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے یہ واضح کریں گے کہ لغت کی بنیاد پہ ان کی جو تعریف کی گئی، اس نے وہ معنیٰ نہیں دیا جو شریعت کا مقصود ہے، اور اسی سے محدثین اور اہل الرائے کے منہج کا فرق بھی سامنے آجائے گا۔

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے جو بنیادی چیز ہے۔ اہل الرائے اس کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق کا، چنانچہ ایک شخص جب اللہ پہ ایمان لے آیا کہ اللہ موجود ہے، اسی طرح رسول اللہ پہ ایمان لے آیا کہ آپؐ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں وہ سچ ہے، تو اس کا ایمان مکمل ہوگیا ـــــ اس لیے کہ لغت میں ایمان کا معنیٰ تصدیق ہی ہے ـــــ اب چونکہ لغت کا تقاضا یہ نہیں کہ عمل کو تصدیق میں شامل کیا جائے، کیوں کہ تصدیق دل کا کام ہے اور عمل کا تعلق حرکات وجوارح سے ہے، لہٰذا ایمان الگ چیز ہوا اور عمل الگ چیز ـــــ نتیجہ یہ نکلا کہ اعمال کو ایمان کی حقیقت سے خارج کر کے یہ سبق دے دیا گیا کہ عمل کی ضرورت نہیں!

لغت کے اس سہارے کے علاوہ اہل الرائے نے بعض شرعی نصوص کے ظاہر سے بھی غلط نتیجہ کا سہارا لیا ـــــ مثلاً حدیثِ جبریلؑ میں دو الگ الگ سوالوں، کہ ایمان کیا ہے؟ اور اسلام کیا ہے؟ ان سے بھی یہ ثابت کیا گیا کہ ایمان اور چیز ہے، جب کہ عمل اور چیز! یعنی اول تو بنیادی طور پہ شرع کو لغت سے تعبیر کیا اور پھر ساری شرعی نصوص میں جب غور وفکر نہ کیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت سے بڑی دُور جا کر گرے، جس کی بناء پر بے عملی کا رجحان پیدا کر دیا گیا۔

اس کے برعکس جب ہم ایمان سے متعلق قرآن وحدیث کی تمام نصوص کو پڑھتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شریعت نے تصدیق کو بھی ایمان کہا ہے، عمل کو بھی ایمان کہا ہے، اور عمل کو ایمان کی حقیقت میں شامل بتایا ہے ـــــ محدثین نے یہی کیا کہ انھوں نے ایمان والی ساری آیات اور تمام احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر ایمان کی حقیقت کو متعین کرنے کی کوشش کی ـــــ اور یوں ان کے ہاں ایمان کی حقیقت وہی بنی جو شرعی حقیقت تھی اور شریعت کو مطلوب!

اصل بات یہ ہے کہ شریعت میں ایمان کا استعمال دو طرح سے ہے، ایک ہے ایمان باللہ اور دوسرے ایمان للہ! ـــــ ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا اعتراف کرنا کہ وہ موجود ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں ـــــ اور ایمان للہ کا مطلب اتباع اور اطاعت ہے ـــــ قرآن مجید میں ہے،

نوحؑ نے جب اپنی قوم سے فرمایا:

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۔" (الشعراء: ۱۱۰)

"اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو!"

تو جواب کیا تھا:

"اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۔" (الشعراء: ۱۱۱)

"کیا ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ آپؐ کی اتباع تو رذالوں نے کی ہے۔"

یہاں پر ایمان اطاعت و اتباع کے معنوں میں ہے۔ اور چونکہ اطاعت و اتباع کا تعلق عمل سے ہے، لہٰذا عمل ایمان کی حقیقت میں شامل ہے۔ اسی بات کو محدثین نے بڑی خوبی سے واضح کیا ہے، اور ان کے ہاں جہاں مقاصدِ شریعت میں بڑی دقتِ نظر ہے، وہاں لغت میں بھی بڑی متانت ہے ـــــ امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے پہلے باب ہی میں فرمایا:

"باب الایمان ۔"

اس کے بعد فرمایا:

"وقول النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم بنی الاسلام علیٰ خمسٍ"

یعنی پہلے "ایمان" کا لفظ لائے، اس کے بعد اس کی تفسیر "بنی الاسلام علیٰ خمس" سے ہو رہی ہے ـــــ اب جن کے ہاں ایمان اور اسلام الگ الگ چیزیں ہیں، وہ کہیں گے کہ یہاں ایمان اور چیز ہے اور اسلام اور چیز! ـــــ لیکن امام صاحب نے بتلایا کہ "آمن لہ" اور "آمن بہ" ان دونوں کے مجموعہ کو "بنی الاسلام علیٰ خمس" کہا گیا ہے، اور یہی وہ ایمان ہے جو کامل ایمان اور مطلوب ہے۔ اس کے بعد "شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ" یعنی عقیدہ کا ذکر کر کے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اعمال کا ذکر ہے۔ گویا دونوں چیزوں (عقیدہ اور عمل) یا بالفاظِ دیگر ایمان باللہ اور ایمان للہ، یعنی اللہ تعالیٰ کی تصدیق اور اس کی اطاعت کو

ایمان کی حقیقت میں بیان کر دیا ــــ اس کے بعد آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا کہ :

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۔ الخ!"

"مومن فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں" (المؤمنون : ۱-۲)

ابتداء میں "مؤمنون" فرما کر اگر معاً بعد ہی بہت سے اعمال کا ذکر کر دیا ہے، تو یہ ایمان للہ ہے ۔ لہٰذا "اسلام" اور "ایمان للہ" یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں ــــ ایمان اسلام سے الگ اور خارج کوئی چیز نہیں ہے ۔

علاوہ ازیں امام بخاریؒ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ ایمان اگر تصدیق کا نام ہے تو تصدیق کیا بذاتِ خود عمل نہیں ہے ؟ اللہ تعالیٰ کو ماننا یقیناً یہ بھی ایک عمل ہے، اور یہ دل کا فعل ہے ــــ قرآنِ مجید میں ہے :

"لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ــــ الاٰية !" (البقرة : ۲۲۵)

"اللہ ربّ العزّت تمہاری لغو قسموں پر تم سے مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے، لیکن جو قسمیں تم دلی قصد سے کھاؤ گے، ان پر مواخذہ کریں گے !"

"كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ" کے الفاظ قابلِ غور ہیں جو دل کے فعل کے ترجمان ہیں ــــ یوں امام صاحب نے قرآنِ مجید کی روشنی میں اس بات کی تردید کی ہے کہ "تصدیق عمل نہیں ہوتی" ــــ پس یہ کہنا کہ ایمان (عقیدہ) اور عمل دو الگ چیزیں ہیں، غلط ہے!

اہل الرّائے نے صرف یہی غلطی نہیں کی، بلکہ اس بنیاد پر انھوں نے جو نتائج اخذ کیے اور جو تخریجات کیں، وہ بھی غلط ہیں ــــ مثلاً :

"ایمان اهل السّماء والارض لا یزید ولا ینقص !"

کہ "آسمان اور زمین میں رہنے والے جتنے بھی مؤمنین ہیں، ان کا ایمان نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے !"

کیوں کہ تصدیق تو بس تصدیق ہی ہے جو ہر مومن کر رہا ہے، لہٰذا اس میں کمی بیشی کا کیا سوال ؟

پھر مزید قدم آگے بڑھایا اور کہا کہ سب کا ایمان برابر بھی ہے، حتیٰ کہ کہہ دیا گیا :

"ایمانی کایمان جبرائیل !"

"میرا اور جبرائیل علیہ السلام کا ایمان برابر ہے !"

اسی پر بس نہیں، ایک عام آدمی کا ایمان نبی کے ایمان کے برابر کر دیا گیا ——— اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ !

——— تو یہ ہیں فقہ اہل الرّائے کی بنیادی خامیاں ! انھوں نے لغت کو اصل قرار دے کر شریعت کو لغت کے تابع کرنے کی کوشش کی کہ جو لغت نے کہا، وہی شریعت کا مقصود ہے ——— حالاں کہ ایمان، کفر، نماز، زکوٰۃ یہ سارے کے سارے اصطلاحی کلمات ہیں جن کی تعبیر وہی کی جانی چاہیے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے۔

اسی طرح کتاب الطہارۃ کے مسائل میں وضو کا معاملہ ہے ——— وضو میں ترتیب شرط ہے کہ پہلے دونوں ہاتھ دھوئے جائیں، پھر کلی کی جائے، ناک میں پانی ڈالا جائے، پھر منہ اور دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھونے کے بعد سر کا مسح کیا جائے، پھر کانوں کا مسح اور پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے جائیں ——— اس ترتیب کے بغیر وضو نہیں ہوگا! جب کہ اہل الرائے کے ہاں یہ ترتیب ضروری نہیں ——— کیوں ؟ اس لیے کہ قرآن مجید میں ہے :

"فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ" (المائدۃ : ٦)

یہاں دو لفظ قرآنِ مجید نے بیان فرمائے ہیں، ایک غسل کا اور دوسرا مسح کا ——— غسل کا لغوی معنیٰ ہے، پانی بہا لینا۔ اور مسح کا لغوی معنیٰ ہے، ایک چیز کو دوسری چیز سے ملا دینا ——— چنانچہ جب لغت کا تقاضا یہی ہے تو پھر جس طرح بھی یہ کام کر لیے جائیں ٹھیک ہیں ——— پہلے منہ دھولو، پھر ہاتھ، پھر پاؤں، پھر ناک میں پانی ڈال لو اور پھر سر کا مسح کر لیا جائے ——— حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی ساری زندگی میں کبھی غیر مرتب وضو نہیں کیا ——— وضو اصطلاحی کلمہ ہے اور آپؐ نے اس اصطلاح کی تفسیر ساری عمر اپنے قول و عمل سے بیان فرمائی۔ لہٰذا محدّثین کا طرزِ عمل یہی ہے کہ وضو اسی طرح کرنا چاہیے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ——— لیکن اہل الرائے کے نزدیک صرف پانی بہا لینا ہی وضو ٹھہرا !

اب اس کے بعد پھر مسح کے بارے تخریجات ہیں کہ کیا ہاتھ لگا لینا ضروری ہے یا گیلی دیوار کے ساتھ اگر سر مار دو اور سر گیلا ہو گیا تو مسح ہو جائے گا ؟ یا بارش ہو رہی ہے پانی سر پر پڑا تو مسح خود بخود ہو گیا ——— خواہ وضو کی نیت کی ہو یا نہ، ابتداء میں بسم اللہ پڑھی ہو یا نہ اور ترتیب کو ملحوظ رکھا یا نہ ——— گویا وضو کا تقدس ہی رخصت ہو گیا، ساری روحانیت ہی جاتی رہی !

اس کے برعکس محدثین نے وضو کو اس کی شرعی اصطلاحی حیثیت میں لیا۔ اس کے تقدس، اس کی روحانیت اور مقاصدِ شریعت کو ملحوظ رکھا۔ جو عبادت کا اصل مقصود بھی ہے، اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تقاضا بھی !

اسی طرح نماز کے مسائل میں ——— حدیث میں ہے، حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے آپؐ کو سلام کہا ——— آپؐ نے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی فرمایا :

"ارجع فصلّ فانّک لم تصلّ !"

"دوبارہ نماز پڑھ، تو نے نماز نہیں پڑھی !"

اس نے دوبارہ نماز پڑھی، آپؐ نے پھر یہی کلمات دوہرائے ——— اور ایسا تین مرتبہ ہُوا ——— بالآخر اُس نے کہا، اللہ کے رسولؐ ! مجھے نماز سکھا دیجیے، مجھے تو ایسی ہی نماز آتی ہے۔ اس پر آپؐ نے اسے نماز کی تعلیم دی اور بالخصوص اسے نماز میں اطمینان و اعتدال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا :

تو نے جب رکوع کیا تو اس میں اعتدال و اطمینان نہیں تھا، جب تو رکوع سے کھڑا ہُوا تو اس کھڑے ہونے میں بھی اطمینان نہیں تھا، سجدوں اور ان کے درمیان جلسہ میں بھی تو نے اعتدال و اطمینان کو ملحوظ نہیں رکھا !

غور فرمائیے، آپؐ کے اس صحابی نے تین مرتبہ نماز پڑھی، لیکن آپؐ نے اس نماز کو نہ صرف قبول نہیں فرمایا، بلکہ "لم تصلّ" کہہ کر اس کے نماز ہونے سے ہی انکار فرما دیا !

اب محدّثین کو دیکھیے ——— وہ رکوع، سجدہ، جلسہ کے معانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال سے متعین کرتے ہیں کہ آپؐ نے ان ارکان کو کیسے ادا کیا ؟ اس کے برعکس

اہل الرّائے کے ہاں مصیبت یہ ہے کہ وہ رکوع اور سجدے کا مفہوم لیتے وقت یہ دیکھیں گے کہ لغویوں نے اس کی کیا تعریف بیان کی ہے —— بھئی کیا یہاں لغت بیان ہو رہی ہے ؟ اور شریعت کیا اللہ ربّ العزت کی مقرر کردہ ہے یا لغویوں کی ؟ نماز رکوع اور سجدہ اللہ کا ہے ، یا کسی اہلِ لغت یا کسی عرب کا ؟ —— وہ معنے مراد لو جو شریعت بیان کر رہی ہے !

محدثین یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی نماز میں وہی غلطیاں کی جائیں گی جن کی نشاندہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی تو یہ نماز ، نماز نہیں ہوگی لیکن اہل الرّائے سے پوچھو ، وہ کہیں گے کہ ایسی نماز ہو جاتی ہے —— اور یہ جتنی نمازیں آپ دیکھتے ہیں —— معاف کیجیے گا ! پٹھانوں والی نمازیں —— مثلاً رکوع میں تھوڑا سا جھکے ، پھر اوپر —— سجدے میں ٹکر لگائی ، پھر اوپر —— دو سجدوں کے درمیان بالکل کوئی وقفہ نہیں ، رکوع اور سجدے کے درمیان عمداً سیدھے کھڑے نہیں ہوتے ، یہ اہل الرّائے کی نماز ہے —— اور ان بیچاروں کا اس میں کوئی قصور نہیں کہ اہل الرائے نے نماز کا تصور ہی یہ دیا ہے ۔

وہ کہتے ہیں کہ رکوع کا لغوی معنیٰ " انحناء " ، یعنی جھکنا ہے —— اور سجدہ کا لغوی معنیٰ " ماتھے کو زمین پر رکھنا ہے " —— رہی رکوع اور سجدہ کی تعریف کو متعین کرنے والی احادیث ، تو وہ اخبارِ احاد ہیں ، جن کی بنیاد پر ہم قرآن کے لغوی مدلول کو ختم نہیں کر سکتے —— دیکھیے کس قدر ٹیڑھا فکر ہے ؟ سوال یہ ہے کہ حدیث آئی کس لیے ہے ؟ قرآنِ مجید ہی تو کہہ رہا ہے کہ :

" وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ " (النحل : ۴۴)

قرآنِ مجید کا جو اصل مدلول ہے ، حدیثیں اسی کو تو بیان کرنے کے لیے آئی ہیں ، اور اگر حدیث کا ہی اعتبار نہ کیا جائے گا تو آخر فقہ کا اعتبار کس بنیاد پر ہوگا ؟

یہیں پر یہ نکتہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے دعاء فرمائی ہے جو حاملِ حدیث ہے —— علمِ حدیث سے عاری شخص کے لیے قرآنِ پاک نیز حدیث شریف میں کوئی مدح نہیں ، کوئی ثناء نہیں ، کیوں کہ حدیث ہی قرآنِ مجید کی تفسیر ہے ۔

قرآنِ مجید میں رکوع کا لفظ آگیا ، سجدہ کا لفظ آگیا ، تو اس کی کیفیت ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لینی ہے ، نہ کہ اہل اللغۃ سے —— ورنہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ

منکرینِ حدیث بھی کہہ دیتے ہیں : الصّلوٰۃ کے جولغوی معنی ہیں، انھیں پورا کرلو تو نماز ہو جائے گی ۔ مثلاً صلوٰۃ کا ایک معنیٰ ہے، جسم کے کچھ اعضاء کو حرکت دینا، لہٰذا جسم کے کچھ اعضاء کو ہلا لیا تو نماز ہو گئی! —— سوال یہ ہے کہ " اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ " کا مفہوم آخر کیا ہے ؟ ظاہر ہے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ذریعے متعین ہو گا —— آپؐ کا ارشادِ گرامی ہے :

" صلّوا کما رأیتمونی اصلّی ! "

" تم نماز اس طرح پڑھو، جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو ! "

چنانچہ نماز کا ایک ایک رکن سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا جائے گا — یہی حال زکوٰۃ، حج اور روزے کا ہے کہ یہ سب حدیث کی روشنی میں انجام دیئے جائیں گے اس کے برعکس جب شرعی مقاصد کو چھوڑ کر محض لغوی تعریفات سے شرع کے باب میں اکتفاء کیا گیا تو اس رویہ نے عقیدہ میں، ایمانیات میں، عبادات میں اس قدر مفاسد چھوڑے کہ پوری شریعت ہی گول ہو کر رہ گئی !

محترم سامعین! مذکورہ تفصیل سے فقہ اہل حدیث اور فقہ اہل الرّائے کے درمیان فرق کسی حد تک واضح ہو گیا ہو گا اور تھوڑی سی بات اس میں فقاہتِ امام بخاریؒ کی بھی آگئی ہے، نیز یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ محدّثین کی فقہ کا منہج اور اس کا انداز کیا تھا ؟ وہ اس بات کے قائل تھے کہ پہلے حدیث کا علم حاصل کرو، اس کی صحت اور ضعف کو پہچانو، اس کے بعد قرآن کا علم حاصل کرو —— اس کے بعد اجتہادات کے مراحل آتے ہیں —— خود اہل الرّائے نے بھی مجتہد کی شرائط یہی گنوائی ہیں کہ اسے حدیث کا علم آتا ہو، اسانید، رجال، جرح و تعدیل، تصحیح و تضعیف پر اس کی گہری نظر ہو —— علم حدیث اجتہاد کے لیے بڑی شرط ہے، اس شرط کے بغیر اجتہاد و فقہ میں نہ تو روحانیت ہو گی، نہ شرعی مقاصد کا لحاظ اور نہ ہی ان سے مطابقت ہو گی —— محدّثین یقیناً فقہاء بھی تھے اور فقہ بھی تھی ان کے پاس، ہاں اس کے باوجود اگر کچھ لوگ انھیں فقیہ ماننے سے ہی انکاری ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خود علم حدیث سے کوسوں دور ہیں، اور یہ بہت بڑی خامی ہے —— دعا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں محدّثین کا اندازِ فقہ اپنانے اور اس منہج پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے —— آمین ! وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین !